اِسلام کا فلسفۂ اخلاق

مولانا محمد فاروق خان صاحب - انڈیا

اخلاق کو انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کی مثال نہیں ملتی جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصور نہ پایا جاتا رہا ہو۔ جو لوگ جبریت (DETERMINISM) کے قائل ہیں، وہ بھی علی الاعلان اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک جھوٹ اور سچ میں یا ایمان داری اور مکر و فریب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچائی، خیر پسندی اور سلامت روی انسان کی مطلوب صفات ہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایفائے عہد کے مقابلہ میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی کے مقابلہ میں خود غرضی کو اور جذبۂ اخوت و ہمدردی کے مقابلہ میں بغض و حسد اور ظلم و ستم کو بہتر سمجھنے لگے۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کے مطالبہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جہاں کوئی اختیار و ارادہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں کسی اخلاق و کردار کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے اِرادہ و اختیار سے ہے۔ انسان کو دنیا میں اِرادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے۔ اس لیے اس کا ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہی چیز ہے جو اُسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

انسانی افعال و کردار کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں۔ شعور کو مادہ کی پیداوار سمجھنا صحیح نہیں،

بے شعور مادّہ کا مطالعہ ایک مادّی تحقیق ہے۔ مادّی اسباب کے ذریعہ سے شعور کی تشریح کسی طرح نہیں کی جا سکتی۔ میکس پلانک (MAX PLANK) نے کہا ہے:-

"کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو محض علت و معلول کے قانون کے ذریعہ اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق کبھی بھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے کسی اور قانون، یعنی قانونِ اخلاقیات کی ضرورت ہے"[1]

انسان کو صاحبِ ارادہ و اختیار قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ نفسِ انسانی کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر اسے اخلاق و کردار کا حامل قرار دینے کے لیے کوئی وجہِ جواز ممکن نہیں ہے۔

اخلاق و کردار کے لیے ارادہ و اختیار کی آزادی کے علاوہ ایسے حقیقی، مستقل اور مطلق (REAL, PERMANENT AND ABSOLUTE) اقدارِ حیات کی بھی ضرورت ہے۔ جو اخلاقی قوانین کا مدار قرار پائیں۔ جن کی قدر و قیمت اضافی اور عارضی نہ ہو بلکہ ان کی قدر و قیمت مستقل اور ذاتی (INTRINSIC) نوعیت کی ہو، جن کے تحفظ کے لیے آدمی اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ نظامِ اخلاق کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا کوئی ایسا مقصود و منتہا نہ ہو، جو مطلق قدر کا حامل ہو، جس کی جانب بڑھنے میں ہم اپنی تمام تر کوششیں صرف کر کے تسکین پا سکیں اور جس تک پہنچنے پر ہماری اپنی تکمیل کا بھی انحصار ہو۔ زندگی کا کوئی بلند مقصود و منشا ہی آدمی کو ہر قسم کی گمراہیوں اور تلوّن و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستے پر لگا سکتا ہے۔ اسی کے حصول کی کوشش انسان کی اصل کامیابی اور اس کی اپنی ذات کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی میں بھی اور خاص طور سے ہماری اندرونی زندگی میں بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اوسپنسکی (OS PENSKEY) نے لکھا ہے:-

---

[1] دیکھیے۔ THE UNIVERS IN THE LIGHT OF MODREN PHYSICS

"انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کرلے، اُسے اپنے آپ کو "میں" کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس کا اپنا کوئی اِرادہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ وحدت حاصل کیے بغیر اپنے آپ کو صاحبِ اختیار و اِرادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ارادہ نتیجہ ہوا کرتا ہے خواہشات کا۔ جس شخص کی خواہشات ہی مستقل نہ ہوں اس کی حیثیت محض اپنے جذبات اور خارجی تاثرات کے کھلونے کی ہوگی۔ اُسے خبر نہیں ہوسکتی کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کر گزرے گا۔ اس کی زندگی کے ہر لمحہ پر اتفاقات کا پردہ پڑا ہوگا۔"[1]

زندگی میں داخلی توافق کی بڑی اہمیت ہے۔ داخلی توافق کے بغیر معاشرہ میں بھی کسی توافق اور وحدت کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ رہا مسئلہ اخلاقی اقدار (MORAL VALUES) کے حصول کا تو حقیقت کے علم کے بغیر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ راشڈل (RASHDALL) کا یہ خیال مبنی برحقیقت ہے:

"یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر اخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو یا ہمارے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہمارا تصورِ حقیقت متاثر نہ ہوتا ہو۔"

حقیقت سے صرفِ نظر کرکے کسی اعلیٰ اور پائیدار نظامِ اخلاق کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مستقل اور مطلق اخلاقی قدروں کے لیے ناگزیر ہے کہ زندگی اپنی کوئی حقیقی غرض و غایت رکھتی ہو۔ اس کائنات کو کسی عظیم مقصد کے تحت وجود بخشا گیا ہو۔ اور کائنات کی تمام چیزیں محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسباب کی حیثیت رکھتی ہوں۔

پھر اس سے آگے بڑھ کر کسی اخلاقی نظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تسلسلِ حیات

---

[1] THE NEW MODEL OF UNIVERSE P. 132-33

پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر ہماری زندگی مسلسل اور مستقل نہیں ہے تو مستقل قدروں سے ہمارا ربط و تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر انسانی افراد کا منتہائے خیال محض قریبی مفاد کا حصول ہو تو کبھی بھی ان کی سیرتوں میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ایسے افراد پر مشتمل کوئی معاشرہ مستحکم اور پائیدار ہو سکتا ہے۔

میکنزی (MACKENZIE) نے اخلاقی مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ہم کہتے ہیں کہ اخلاقیات کے مطالعہ کا تعلق ایسے انسانی کردار سے ہے جو حق اور خیر کا حامل ہو تو اس سے ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے کہ ہمارا کردار (CONDUCT) کسی ایسے منتہا یا آئیڈیل (END OR IDEAL) کے لیے مفید ہوتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہو اور اس کا تعلق ان قوانین اور اصولوں سے ہوتا ہے جن کی رہنمائی میں ہمارا کردار اس منتہا کے حصول کے لیے صحیح رُخ اختیار کرتا ہے۔ یوں تو مختلف مقاصد کے لیے ہم کام کرتے ہیں، جیسے مکان کی تعمیر، کتاب کی تصنیف وغیرہ، لیکن اخلاقیات میں کردار کا مطالعہ بحیثیت "کُل" (AS A WHOLE) کے مطلوب ہے۔ یہ کسی مخصوص قسم کے کردار کا مطالعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ مختلف مقاصد میں سے کسی ایک مقصد سے تعلق نہیں رکھتا جو اس کے پیشِ نظر ہو، بلکہ اس کا تعلق اس بڑے اور آخری منتہا سے ہے جو ہماری پوری زندگی کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے۔ اس منتہا کو بالعموم "خیرِ اعلیٰ" کی حیثیت دی جاتی ہے"۔ [1]

دُنیا میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم اور قابلِ قدر شے وہ ہے جسے اہلِ یونان نے ناؤس (NOUS) یا نوٹک ناوز (NOETIC NOUS) کا لقب دیا ہے۔ جس کو عربی زبان میں نفس یا نفسِ ناطقہ کہتے ہیں۔ اسی کو بھارت میں آتما سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نفس کی مادّہ سے الگ اپنی مستقل ہستی ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے کائنات کے اندر اسے فوقیت حاصل

---

[1] A MANUAL OF ETHICS P 2

ہے۔ کائنات میں مرکزی حیثیت نفس کی ہے۔ کائنات کی ساری رعنائی و دلکشی کا ادراک نفس کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسی کے سبب سے کائنات میں معنویت کی نمود ہے۔ ساری کائنات کا جوہر حقیقی نفسِ ناطقہ ہی ہے۔ کائنات میں جو چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں وہ نفس کے امکانات کے سوا اور کچھ نہیں۔ نفس ہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جب اصل صورتِ حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کی کوئی چیز بھی نفسِ انسانی کا مقصود نہیں ہو سکتی۔ نفس کا مقصود وہی ہوگا جو اس سے عظیم تر اور اعلیٰ ہو۔ اس لیے لازماً نفسِ انسانی کا مقصود و منتہا ایک نفسِ مطلق (SUPREME AND ABSOLUTE PERSONALITY) ہی ہو سکتا ہے۔ ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ نفس ہر اعتبار سے اپنا مقصود خود ہے لیکن اس میں بعض ایسی دشواریاں ہیں جن کا حل ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات کے باوجود نفس قائم بالذات نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی خالق نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کامل ترین (PERFECT IN HIS PERSONALITY) کی صورت میں ہوتا۔ اسے خود کا پورا علم ہوتا۔ اس کے لیے ضلالت اور گمراہی کے الفاظ بے معنی ہوتے اور اس کی تکمیل کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اگر نفس کے مقصود کو ہم شخصیت (PERSONALITY) سے عاری تسلیم کریں تو اس صورت میں وہ نفسِ انسانی سے کمتر و فروتر ہوگا۔ اور اُسے کوئی شخص نفس کا مقصود قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے لازماً اپنا مقصود و منتہیٰ کوئی ذاتِ مطلق (ABSOLUTE PERSONALITY) ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہی ذات ہے جس کو دنیا خدا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ خدا ہی درحقیقت تمام حقیقتوں کا سرچشمہ اور ہماری ہستی کا اصل مرکز و محور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل کا تصور ذاتِ مطلق کے بغیر ممکن نہیں اور نہ حیاتِ اُخروی پر ایمان لائے بغیر حیات کے تسلسل کا مسئلہ حل ہوتا ہے، جس سے اخلاقی قدروں کے حصول کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

انسان کے لیے کسی ایسے اخلاقی نظام کا تصور جس کی بنیاد مادیت کے بجائے عالمگیر معنوی اُصولوں پر قائم ہو کوئی ایسا تصور نہیں ہے، جس سے ہماری زندگی مناسبت نہ رکھتی ہو۔

ہم میں ہر شخص اپنے ہر دنیوی معاملہ میں کوئی نہ کوئی معنوی نقطۂ نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ انسان غیر شعوری طور محض میکانی انداز میں اپنا کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا علم و ارادہ کام کرتا ہے۔ مآل اندیشی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ خالص مادیت کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے کہ کوئی انسانی اصولوں کے مطابق عمل کیوں کرے؟ اپنے قریبی مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام کوئی کیوں آئے؟ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہم کیوں اختیار کریں؟ اس میں شبہ نہیں کہ مادیت کے علمبرداروں میں ایسے اشخاص ملتے ہیں جنہوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی حمایت میں وہ سرگرم کار رہے ہیں، لیکن ان کا یہ طرزِ عمل ان کے بنیادی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ مادیت کا نہیں، مادیت سے ماورا کسی اور شے کا اثر تھا جو ان کے نفس کے کسی گوشے میں چھپا رہا ہے۔

اخلاقی اقدار کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اخلاق ہی وہ قابلِ قدر جوہر ہے، جس کے ذریعے سے روحانی، مادی اور جمالیاتی (AESTHETIC) قدروں میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ذریعے سے معاشرے میں پائے جانے والے تضادات باہمی توافق میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ قوت ہے جس سے انسان کی زندگی اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ حقیقت کے ساتھ زندگی کی یہی ہم آہنگی اور توافق ہے جس کو مفکرین نے حقیقی آزادی اور حصولِ صداقت سے تعبیر کیا ہے۔

مادہ پرست، مادہ ہی کو اصل حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں جو کچھ بھی ہے وہ محض مادہ کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً ان کے بعض لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ معاشی نظام کی ہیئت ہی میں انسانی زندگی کا سارا راز پنہاں ہے۔ مذہب و اخلاق، تہذیب اور کلچر سب معاشی صورتِ حال کی پیداوار ہیں۔ درحقیقت حقائق کا یہ نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ مارکس اور مارکس کے متبعین کم از کم اگر نفسیات اور اینتھروپولوجی ہی سے واقفیت رکھتے تو نفسیات انہیں بتاتی کہ پیداواری طاقتیں انسانی دماغ کے اعمال و افعال کی تشریح سے یکسر قاصر ہیں۔ انسانی ذہن

ذرائع پیداوار کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایغمقر ویو لوچی انھیں اس بات سے واقف کراتی کہ روحِ انسانی فریب محض نہیں ہے بلکہ انسانی کلچر کی پیدائش اور اس کی نشوونما میں درحقیقت اسی کی جلوہ گری ہے۔ مادی اسباب کو وہی کام میں لاتی اور ان سے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے۔ مختلف اسالیب میں اسی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود یہ کائنات صرف افادیت کی جس سے ہمارے مادی مفادات وابستہ ہوتے ہیں مظہر ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اندر دوسرے اور قابلِ لحاظ اشارات بھی پائے جاتے ہیں جو افادیت سے برتر ہیں، جن کو نظرانداز کر کے کائنات کی جو توجیہہ بھی کی جائے گی، ناقص اور غلط ہوگی۔ کائنات معنی رکھتی ہے۔ زندگی معنویت کی حامل ہے۔ اس کی دریافت سے مادیت بالکل قاصر ہے۔ کائنات کے اندر نمایاں طور پر کسی بلند و برتر ذات کے علم و ارادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کائنات کے اندر کسی کے علم و ارادہ کے کارفرما ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ساری کارفرمائی اخلاق کی ہے۔ علم و ارادہ کا ظہور ہمیشہ اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ انسان کی ضروریات اور کائنات کی فراہم کردہ اشیاء میں انتہائی گہرا ربط اور تعلق ہے۔ جسم کو برقرار رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب انسان اپنے خارج میں موجود پاتا ہے۔ یہ بہتے دریا، یہ چشمے اور میدان، یہ مختلف قسم کے درخت اور جانور، یہ پھول، پھل اور کھیتیاں انسان کے فطری مطالبات کا جواب ہیں۔ انھیں خالق کی رحمت کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اشیاء جنھیں ہم اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں، درحقیقت اخلاقِ خداوندی ہی کے زندہ مظاہر ہیں۔

اخلاقی کارفرمائی کی اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح تصویریں موجود ہیں، لیکن انسان ان کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے کی پرورش میں اصل دخل والدین یا اعزہ و اقربا کی اس شفقت و محبت کا ہوتا ہے جو انھیں بچے سے ہوتی ہے۔ یہ اخلاق کا کرشمہ ہے نہ کہ خالص مادیت کا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اگر ہمیں ذوقِ جمال سے نوازا گیا ہے تو دوسری طرف کائنات کی ہر چیز کو حسن اور آراستگی بخشی گئی ہے۔ اس کو محض مادہ کی کرشمہ سازی

قرار دے کر مطمئن ہو رہنا ذہنی و فکری خودکشی کے مترادف ہے۔ مارکس اور دوسرے مادہ پرست اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک فائق تر شے اپنے سے ادنیٰ درجے کی چیز کی تابع کیوں کر ہو سکتی ہے۔ زندگی شعور و احساس کی ایک آباد دنیا ہے، جس کا سرچشمہ کوئی باشعور قادرِ مطلق ذات ہی ہو سکتی ہے اور صرف وہی ذات زندگی کا مقصود و منشا بھی قرار پا سکتی ہے۔ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کر کے صرف یہی نہیں کہ انسان خدا کے حقوق کو نظر انداز کرتا ہے، بلکہ اس کا یہ رویہ خود اس کے اپنے خلاف بھی ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی حیثیت کو گرا دیتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے جسم کے تمام اعضاء ہاتھ، پیر وغیرہ بظاہر اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت جو کچھ ہے وہ ہماری شخصیت کی نسبت سے ہے۔ اگر ہمارے دست و پا ہماری شخصیت کے تابع نہ ہوں تو ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے۔ نظامِ جسمانی میں مرکزی حیثیت ہماری شخصیت کو حاصل ہے۔ اس لیے ہمارے تمام اعضا اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لیے ہر لمحہ ہمارے دستِ نگر رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اصل حیثیت کی تعیین خدا کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اس نسبت و تعلق کے بغیر ہماری حالت ایک ایسے ہاتھ پیر کی رہ جاتی ہے جس کو جسم سے کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا ہو۔ ایسے کٹے ہوئے ہاتھ پیر اور خاک کے ڈھیر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہتا۔ انسان یہ تو سمجھتا ہے کہ ہاتھ یا پیر کا جسم سے کٹ کر الگ ہونا اس کے لیے ہلاکت ہے۔ لیکن اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے وہ اس ہلاکت کو محسوس کرنے سے بالعموم قاصر رہتا ہے جس میں وہ خدا سے الگ ہو کر مبتلا ہوتا ہے۔

اخلاق انسان کے لیے کوئی ناخوشگوار بوجھ ہرگز نہیں ہے۔ رنگ و بو پھولوں پر بوجھ نہیں، پرندوں کے پر پرندوں پر کبھی بار ثابت نہیں ہوتے، بلکہ یہ پر اُن کے لیے باعثِ زینت بھی ہیں اور پرواز میں ان کے مددگار بھی۔ یہی حال پھولوں کے رنگ و بو اور آنکھوں کی پلکوں کا بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بھی حقیقی حُسن و خوبی اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق سے عاری ہو جانے کے بعد انسان کے پاس کوئی قابلِ قدر شے باقی نہیں رہتی۔ اخلاقی مطالبات ہماری فطرت کے اظہار کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اور آفاقی اصول کا نام ہے۔ یہی ہماری باطنی زندگی کا بھی قانون ہے۔ یہ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعے سے انسان کی اندرونی زندگی میں توازن اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ آفاقی اصول ہے، جس کا مشاہدہ ہم کائنات کے نظام میں بھی کرتے ہیں۔ کائنات کی ساری چیزیں ایک صحیح اور فطری قانون کے تابع ہیں، جس کے پیچھے خدا کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے پر آج بڑے سے بڑے مفکر بھی اپنے کو مجبور پا رہے ہیں۔ انہیں یہ ماننا پڑا ہے کہ یہ کائنات ایک مشین کے مشابہ ہونے کے بجائے ایک ذہن سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

(باقی)

(بقیہ مسلمانوں کا پہلا شہر)

کیوں نہ مجبور کرتے۔ ایسے عاملینِ حکومت کو تو وہ ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مسند امام احمد میں ہے حضرت عتبہؓ کہتے تھے ـــــ دوستو! میں خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ حقیر ہونے کے باوجود اپنے کو بڑا سمجھوں۔ نبوّت ختم ہو چکی ہے۔ انجام یہ ہو گا کہ اقتدار کے مراکز قائم ہوں گے اور تم بہت جلد ہمارے بعد امیروں کو آزماؤ گے۔

حضرت عتبہؓ نے اپنی خدمت چھوڑ دینے کی جو درخواست امیرالمومنین سے کی تھی جب اسے انہوں نے قبول نہ کیا تو اسُدالغابہ میں ہے کہ سفر کا آغاز کرتے ہی راستے میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ بارِ الٰہا! تو مجھے بصرہ نہ پہنچا! دن پر دن منزلیں گزرتی گئیں۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا کا کوئی اثر دیکھنے میں نہ آیا۔ ابن سعد اور ابن کثیر کی روایتیں جوڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کچھ دنوں بعد پیٹ میں درد اٹھا۔ معدن بنی سلیم تک پہنچے تھے کہ حالت بگڑ گئی، ایسی کہ اونٹ پر سے گر پڑے۔ وہ تکلیف اور یہ صدمہ ۵۷ برس کی عمر تھی۔ گرے تو پھر نہ اٹھے۔ خدا نے ان کی سن لی اور بصرہ ہمیشہ کے لیے ان سے چھوٹ گیا۔